کے لیے میں نے اپنی نشست کا انداز بدلا لیکن پھر بندر کا بندر ہی رہا۔ میں نے اپنی ٹانگیں آگے کو پھیلا دیں۔ پھر بھی میری تسلی نہ ہوئی۔ آخر میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

صحن کے اندر جا بجا چولائی، دھتورے، پوہلی اور بھکھڑے کے پودے اُگے ہوئے تھے۔ دیواروں میں اِدھر اُدھر پیپل کے نوجوان پودے لہلہا رہے تھے اور جو تناور ہو گئے تھے انہوں نے دیواروں کو گرا دیا تھا اور اب گرے ہوئے ملبے کے ڈھیر میں ایستادہ ہو گئے تھے۔ کوٹھڑیوں اور کمروں کی دیواریں کھڑی تھیں لیکن سب کی چھتیں گر چکی تھیں۔ ٹوٹے ہوئے دروازوں سے بے چھت والانوں کی روشنی ننگی دیوانی عورت کی طرح کھڑی تھی۔ نہ ادھر دیکھنے کو جی چاہتا تھا نہ اُدھر سے نظر ہٹانے کو دل کرتا تھا۔

دِتو منگ لنگور کی طرح اپنے بھٹ سے برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں روٹی کا ایک گالا اور گہرے سبز رنگ کی ایک بوتل تھی۔ وہ لپک کر پھر اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ گیا اور گالے سے روٹی توڑ توڑ کر باریک اور لمبی لمبی پونیاں بٹنے لگا۔ پھر اس نے روٹی کا آدھا گالا توڑ کر میری طرف پھینکا اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ چل تو بھی بنا۔ میں نے پہلے ہاتھ سے پونی بنانے کی کوشش کی اور ناکام رہا۔ پھر میں نے قریب پڑی ہوئی ایک سینک اُٹھالی اور اس کی مدد سے پونی بٹنے کی کوشش کرنے لگا۔ مجھے سینک کی مدد لیتے ہوئے دیکھ کر پہلے وہ مسکرایا، پھر ہنسا اور آخر میں ایک بہت بڑا قہقہہ مار کر پہلے کی طرح خاموش ہو گیا۔

"کیا سالی خوفناک تنہائی ہے۔" اعظمی بولا۔ "دیکھو اس کو۔"

"کس کو؟" عمّاد نے پوچھا۔

"اس کو جو یہ قصہ سنا رہا ہے۔" اعظمی نے کہا۔ "کوئی ہیں زندہ رہنے کے اثر آثار۔ اگر اس کو سچ بھی مان لیا جائے تو بھی اس پر یقین نہیں آئے گا۔"

"لیکن شاہ جی۔" مسعود نے کھی کھی کر کے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ سالا تم سے پونیاں کیوں بٹوانے لگا۔"

"شکر کرو پونیاں ہی بٹوا تا رہا۔" اعظمی نے ہنس کر کہا۔ "ورنہ اس نے اور بہت کچھ بٹوا لینا تھا۔"

"مر گیا؟" مفتی جی نے اچانک پوچھا۔

"نہیں سر مرا کہاں۔" میں نے پھر کہنا شروع کیا۔ "وہ تو پاکستان بننے کے آٹھ سال پہلے تک

وہیں رہا پھر اس کے بعد اچانک غائب ہو گیا۔"

"تمہیں بھی بتا کر نہیں گیا؟" لیڈر نے پوچھا۔

"نہیں اس نے مجھے اپنے یہاں آنے جانے کی مناہی کر دی تھی۔"

"اس کھنڈر میں آنے کی مناہی کر دی تھی؟" عمّاد نے پوچھا۔ اس لنگور نے؟"

"ہاں اس نے میری کُھتی پر اپنا تیلیا ہاتھ جما کر زور سے دھکا دیا تھا اور کہا تھا خبردار پھر ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔"

"لیکن کیوں؟" مُفتی جی نے پوچھا۔ کس لیے۔ کیوں وہ اس قدر اگریسو ہو گیا؟"

اس کا ایک شوق تھا مُفتی جی اور وہ شوق اس کو دل و جان سے پیارا تھا۔ وہ تازہ دھنکی ہوئی رُوئی کی پُونی مٹی کے تیل میں تر کر کے اپنی مقعد میں رکھ لیتا تھا۔ تقریباً ایک چوتھائی اندر اور تین چوتھائی باہر۔ پھر آسمان کی طرف نگاہیں اُٹھا کر اور دونوں ہاتھ باندھ کر وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا اور اپنے بڑے پتھر کے آس پاس آجاتا۔ وہاں سے ماچس اُٹھا کر تیل میں سنی ہُوئی لٹکتی بتی کو دیا سلائی دکھاتا اور چیخیں مارتا ہُوا کھنڈر کے صحن میں چکر لگانے لگتا۔ جوں جوں آگ اُوپر کو لپکتی توں توں اس کے نعرے اور چیخکارے بلند ہونے لگتے۔ ان نعروں اور للکاروں میں کرب بھی ہوتا اور پکار بھی، لذت بھی اور خوف بھی، خودستائی اور رجز خوانی بھی، عاجزی اور بینتی بھی۔ اس کا سارا بدن پسینے سے شرابور ہو جاتا اور وہ ہانپتا ہُوا بڑے دالان کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ اس کی رانوں کے درمیان سے دھواں بھی نکل رہا ہوتا اور آبلوں کا پانی بھی ٹپک رہا ہوتا۔ اس وقت وہ آسمان کی طرف منہ کر کے اس طرح گڑگڑاتا جیسے جوانی میں قدم رکھنے والا بچھیرا گھوڑی کو دیکھ کر پہلی مرتبہ ہنہنایا ہو۔ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے اور پھر آہستہ آہستہ اس کے حلق سے ایسی آواز نکلنے لگتی جیسے کوئی بے چھلے ہوئے گنے کی پوری ایک طرف چاقو اور دوسری طرف انگوٹھے کے دباؤ سے گول گول کاٹ رہا ہو۔

جب میں یہ بات کر رہا تھا تو ہم سب نے رستہ چلنا بند کر دیا تھا۔ مُفتی اور مسعود مجھ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے تھے اور دوسرے تینوں اپنی اپنی سوٹیاں سینے کے ساتھ لگا کر اپنے آپ کو چھپیاں ڈال کر کھڑے ہو گئے تھے۔

کانٹا کیسا؟" عماد نے پوچھا۔

"فورک۔ جس سے کھانا کھاتے ہیں۔ چھری کانٹے والا کانٹا۔"

"وہ اس سالے کے پاس کہاں سے آگیا؟" اعظمی نے پوچھا۔

"بس آگیا کہیں سے تم کو اس سے کیا۔" مفتی نے خفگی سے کہا اور مجھے بات جاری رکھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا: "تھوڑی دیر تک وہ کانٹا ہاتھ میں پکڑ کر کانپتا رہا۔ پھر کراہنے لگا اور جب اس کے حلق سے چاقو سے گنڈیری کٹنے والی آواز آنے لگی تو ایک دم بجلی کی تیزی سے اچھلا اور وہ کانٹا اس پیپل کے پتے میں بھونک دیا۔ کانٹے کی چاروں آہنی انگلیاں پتے میں سے گزر کر زمین میں دھنس گئیں اور اس کا دستہ زمین پر عمود گرانے لگا۔ پھر وہ خوشی کے ساتھ اچھلا اور دائیں چرخ کھنی بائیں گندے ہاتھ میں رکھ کر کھڑی بانہہ کا گھوٹنا بنا کر گھوڑا ہشیاری کرنے لگا اور زور زور سے قہقہے لگانے لگا۔ وہ اس گھنیے ہوئے کانٹے کے گرد چکر کاٹ رہا تھا اور میں خوف کے ساتھ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اس دن جیسا خوف مجھے پھر کبھی نہیں آیا۔

اگلی صبح قصبے کے لوگوں نے دیکھا بابا کریما اپنے کھیت میں اوندھا گرا ہوا ہے اور دھڑاڑ نے والی ترانگلی اس کی کمر اور پسلیوں میں سے گزر کر زمین میں دھنسی ہوئی ہے۔"

"ترانگلی کیا؟" اعظمی نے پوچھا۔

"ریک نہیں ہوتی آر اے کے ای۔ ریک۔" میں نے کہا۔ "لکڑی کی وہ لاٹھی جس کے آگے فولاد کی فٹ فٹ ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ کی تیز نوکیں لگی ہوتی ہیں۔"

"اوئے جس سے کسان لوگ گڈ پر سے پرالی چھاپے، لانگا وغیرہ اُتارتے ہیں، جس سے دھواڑا اُڑا کر بھوسہ اور دانہ الگ کرتے ہیں۔" مسعود نے بتایا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔" لیڈر نے کہا۔ "بڑا سا کانٹا ہوتا ہے لمبا ڈنڈا اور آگے تیز تیز فولادی انگلیاں۔"

"بس بس وہی۔" میں نے کہا: "اس ترانگل کی پانچ تیز تیز فولادی انگلیاں بابے کریمے کے پنجر میں سے گزر کر چھ چھ انچ تک زمین میں دھنس گئی تھیں خون مٹی میں جذب ہو گیا تھا۔ بابے کی ایک جوتی اُتری ہوئی تھی اور دوسری بدستور پیر پر موجود تھی۔

پولیس نے آکر نقشہ بنایا اور گاؤ قصائی، جس نے بابے کریمے سے سو روپے ادھار مانگے تھے

"ایک شام بابے کریمے نے دِتّو ملنگ کو اپنے کھیت کے قریب سے گزرتے دیکھ کر اس پر رساہُوا ایک کڑوا تُمّا پھینکا۔ تُمّا اس کے گھون مون تیل چُپڑے سر پر لگا اور پھٹ گیا۔ دِتّو ملنگ نے اپنے سر پر ہاتھ پھیر کر چکھا تو تڑپ کر تھوکر دی۔ اس کے تھوُ والے احتجاج پر سب مزارع کھلکھلا کر ہنس پڑے اور اپنی دائیں کہنیوں کے نیچے بائیں ہتھیلیاں رکھ کر کھڑے دائیں ہاتھ کی مٹھی بند کر کے فحش طریقے پر ہلانے لگے۔ کل پانچ مزارع تھے اور پانچوں کے پانچوں قطار میں کھڑے اس طرح گھوڑا ہشیار کر رہے تھے۔ بابا کریما ان کی کارکردگی دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ گو اوپر اوپر سے کہہ رہا تھا "نہ کرو اوئے مُنڈیو نہ کرو۔ بس جان دیو"

تھوڑی دیر تو دِتّو ملنگ کھڑا ان کی طنز کا نشانہ بنتا رہا۔ پھر منہ پر ہاتھ پھیر کر آگے کو روانہ ہو گیا۔

مجھے یاد ہے اس دن ہم میٹرک کے داخلے کے فارم بھر کر گھر آئے تھے اور ہوشیار پُور سے ماموں نذر ہمارے لیے اور اپنی بہن کے لیے بہت ساری سوغاتیں لے کر آئے تھے۔ میرے ایک ہی ماموں تھے اور جب یہ ہمارے گھر آ جاتے تو سکول جانا، دوستوں سے ملنا، کھیل میں شامل ہونا، آوارہ گردی کرنا سب موقوف ہو جاتا۔ لیکن اس شام ماموں نذر کی آمد کے باوصف مَیں دِتّو ملنگ کے کھنڈر میں پہنچ چُکا تھا۔ اس وقت وہ تیسری مرتبہ فلیتہ لگا کر اپنی "اسے نس" کو بُری طرح جُھلس چُکا تھا اور کراہنے کے بجائے مسکرا رہا تھا۔

جب مَیں اس کی خدمت میں حاضر ہُوا تو اس نے مسکرا کر پہلی مرتبہ مجھے دعا دی "جیارہ بیٹے جیارہ" اور آ کر اپنی پتھر والی نشست کے قریب زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ پھر اس نے دو اینٹوں کے درمیان سے پیپل کا ایک پژمُردہ پتّا نکالا اور اس کو اپنے سامنے زمین پر رکھ کر گھورنے لگا۔ پھر مجھے سلور کا کٹورہ دے کر سر کے اشارے سے پانی لانے کے لیے کہا۔ مَیں اس کی ٹوٹی ہوئی ٹھلیا سے پانی لایا تو وہ پتّے کے دونوں جانب پاؤں رکھ کر بوں بیٹھ گیا جیسے تدمچے پر بیٹھتے ہیں۔ پھر اس نے کٹورے کا پانی اپنے سر پر ڈالنا شروع کیا جو باریک سی تلتلیوں کی شکل میں اس کی پیٹھ اور پہلوؤں سے بہہ گیا۔ گویا وہ اس پتّے پر بیٹھ کر نہا گیا۔

جب یہ عمل ختم ہو گیا تو اس نے مجھے کھڑے ہونے کے لیے کہا۔ مَیں چُپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ اس نے قہر آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور اپنے پتھر کے نیچے سے ایک کانٹا نکال لیا۔

اور نہ ملنے پر سواد چکھانے کی دھمکی دی تھی گرفتار کر لیا گیا۔ اس کی گرفتاری کے بعد میں بھاگا بھاگا دِتو ملنگ کے اڈے پر پہنچا، تو اس نے اپنا تیلیا ہاتھ میری کُھتی پر جما کر زور سے دھکا دیا اور کہا خبردار پھر ادھر آنے کی کوشش نہ کرنا ورنہ مجھ سے بُرا اور کوئی نہ ہو گا۔

اور یہ جو آدمی ابھی ہمارے قریب سے گزر گیا ہے اور جس نے ہمارے سلام کا جواب نہیں دیا مجھے دِتو ملنگ لگتا ہے، حالانکہ اس کی عمر اس سے کم ہے۔ اس کی جلد اس سے ملائم ہے! اس کے سر اور چہرے پر گھنے بال ہیں۔ پھر بھی یہ مجھے وہی لگتا ہے۔

مسعود، تمہ، دُ اعظمی، عمر اور مُفتی گردنیں لمبی کر کے پیچھے جاتے ہوئے نقطے کو غور سے دیکھنے لگے کہ شاید اس کی رانوں کے درمیان سے مٹیالا دھواں اُٹھ رہا ہو۔

دِتو ملنگ کے واقعے نے ہم سب کو تھوڑی دیر کے لیے خاموش کر دیا۔ اصل میں واقعہ بیان نہ بھی ہوتا تو بھی، ہمیں تھوڑی دیر کے لیے خاموش ضرور ہو جانا تھا۔ گفتگو کے بعد خاموشی آپ ہی در آتی ہے۔ جنگوں میں بھی جب دونوں طرف سے شدید گولہ باری ہوا کرتی ہے، تو ایک وقفہ خاموشی کا آ جاتا ہے۔ کہ سن کر یا کسی وقت مقررہ پر نہیں، بس یوں ہی، بغیر سوچے سمجھے۔ بغیر جھنڈی ہلائے۔ کسی کاشن یا آرڈر کے بغیر، بنا سوچے سمجھے۔ طوائف اور تماش بین کے درمیان بھی خاموشی کا ایک طویل لمحہ آ جاتا ہے۔ بہتے ہوئے پُرشور پانیوں میں بھی اچانک سکوت آ جاتا ہے۔ شاید آپ نے محسوس لیا ہو گا کہ ایک ساتھ چلتی ہوئی بہت سی مشینیں بھی ایک وقت خاموش ہو جاتی ہیں، حالانکہ وہ چل رہی ہوتی ہیں، لیکن آپ کو ان کا شعور نہیں ہوتا۔

ہم چلے جا رہے تھے اور خاموش تھے، جیسے نوجوان گایوں کے گلے میں اُونچی کوہان اور مضبوط پٹھے والا سانڈ چلا کرتا ہے اور اس کے گلے کی جھالر میں آدھے پونے بھنور سے پڑا کرتے ہیں۔

اچانک ایک مضبوط، دل دار، سرسبز اور وزنی پتہ لیڈر کی گردن پر آ گرا۔ وہ تڑپ کر اُچھلا اور اُس کے مُنہ سے ایک خوفناک چیخ نکل گئی۔

ہمارا لیڈر بھی دُوسرے لیڈروں کی طرح بزدل اور ظالم ہے۔ وہ اندر سے مسلسل لرزتا رہتا ہے اور باہر سے ہر ایک کی سرزنش کیا کرتا ہے۔ اس کا قد چھوٹا، بدن مضبوط اور آنکھیں تیز ہیں۔

دوستی اور ڈسپلن کا قائل ہے اور اس کے ہاتھ کی چھڑی کبھی بھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ ہم نے متفقہ رائے سے اس کو اپنا لیڈر چنا ہے اور اگر ہم اسے اتفاقِ رائے سے بھی چنتے تو بھی وہ ہمارا لیڈر ہوتا، کیونکہ اُس میں ایک اچھے لیڈر کے سب خصائص موجود ہیں اور ایسے خصائص والا آدمی لیڈر بنے بغیر نہیں رہ سکتا۔

مسعود نے گھبرا کر پوچھا:

"کیا ہوا لیڈر، کیا ہوا؟"

تو لیڈر نے اپنی گدی پر ہاتھ رکھے رکھے اسے یوں گھور کر دیکھا جیسے لیڈر غصّے کے وقت دیکھا کرتے ہیں۔

"کچھ تھا، بہت وزنی" اس نے آہستہ سے کہا۔ "جیسے کوئی پنجہ ہو"

"لو جناب! یہ پنجہ ملاحظہ فرماؤ" اعظمی نے جھپک کر زمین سے وہ پتا اٹھا لیا اور ہم سب کی نظروں کے سامنے گھما دیا: "دیکھا آپ نے یہ فولادی پنجہ۔ گریباں گیر، جو ہماری قیادت کی گردن سے چمٹ گیا"

"اور قیادت یوں اچھلی تھی جیسے سانپ کی دُم پر پیر آگیا ہو" ــــــ مسعود نے ہنس کر کہا۔

عماد نے وہ پتا اعظمی کے ہاتھ سے لے کر بغور دیکھا اور پھر مفتی کو دیتے ہوئے بولا: "ہو سکتا ہے مفتی جی، یہ ویسا ہی پتا ہو دتّو ملنگ والا"

"کیوں نہیں، کیوں نہیں" مفتی بولا۔ "ہر پتّے کی ایک اپنی مگنیٹک فیلڈ ہوتی ہے"

عماد نے ہنس کر کہا:

"آپ کے خیال میں یہ پتا ریڈیو ایکٹو ہے"

"جی جناب!" اعظمی سنجیدگی سے بولا۔ "اگر یہ پتا چارجڈ نہ ہوتا، تو لیڈر اس طرح سے کیوں اُچھلتا سہما ــــــ نباتات کی زندگی کے کچھ پہلو حیوانی زندگی سے بھی کڑے ہوتے ہیں"

"ہاں جی" مسعود نے کہا۔ "اس کو معلوم ہے اچھی طرح سے۔ یہ خود برسیم کی سُنڈی رہ چکا ہے، ریڈیو میں آنے سے پہلے۔"

کوہستانی نے حیرانی سے اعظمی کی طرف دیکھا۔ سارے سفر کے دوران میں اس کا یہی خیال تھا کہ اعظمی بھی ہماری طرح کا انسان ہے، لیکن مسعود کی بات سے وہ تذبذب میں پڑ گیا اور آہستہ سے پوچھنے لگا:

"کون؟ یہ صیب؟ عینک والے!"

"بالکل خان! یہی۔" مسعود نے جواب دیا۔ "یہ پہلے سُنڈی ہوتا تھا۔ پیر کی دُعا سے آدمی بن گیا۔"

"سُبحان اللہ جی!" کوہستانی نے اپنا ہاتھ چُوم کر ماتھے پر رکھا اور سر ہلا کر کہا: "وہ تو اللہ کے فضل سے جو چاہے کر سکتا ہے۔"

"یہ تو خیر بکواس کرتے ہیں خان!" اعظمی نے پتّا سُونگھ کر کہا۔ "لیکن درختوں میں اور پتّوں میں اور بُوٹوں میں بھی ہماری طرح سے جان ہوتی ہے۔"

"پہلے نہیں ہوتی تھی صب!" کوہستانی نے کہا۔ "پر جب حضرت زکریا علیہ السّلام نے بھاگ کر درخت میں پناہ پکڑی اور ظالم کافروں نے تنے کے ساتھ ان کو بھی چیر دیا، تو اللہ تعالیٰ نے کہا صبر کرو۔۔۔ صبر کرو زکریا۔ اب نہیں بولنا۔ شور نہیں مچانا اور حضرت زکریا نے صبر کیا جی، تو پھر سارے درختوں میں جان پڑ گئی۔ ان کا رُوح ہے جی، پیغمبر علیہ السّلام کا ان میں۔"

"شاباش۔" اعظمی نے کہا۔ "تم تو پیغمبروں کے راز سے بھی واقف ہو اور ان گدھوں کو دیکھو سب پڑھ لکھ کر برباد کر دیا۔"

مفتی نے کہا:

"دیکھو یار! اس علاقے کی اکولوجی کس قدر مختلف ہے۔ کوہستانی بھی ایسے بول رہا

ہے جیسے ڈاکٹر ینگ بات کر رہا ہو۔ ہے ناں پریوں کا اور طلسم کا راج اِس علاقے میں!"

ہم چل تو رہے تھے، لیکن لیڈر بار بار اپنا ہاتھ گدّی پر لے جاتا تھا۔ حالانکہ پتا ابھی تک اعظمی کے ہاتھ میں تھا۔

"اس پتے پر" اعظمی نے کہا۔ "بڑی ضد ہے، ڈنڈی سے پکڑ کر مروڑی دو، تو ایک آدھ پھیری سے زیادہ نہیں گھومتا۔ واپس مڑتا ہے، بڑا ہٹ دھرم ہے۔"

"پھر؟" عماد نے پوچھا۔

"پھر کیا!" اعظمی بولا۔ "دوسرے جانداروں کی طرح اپنی انفرادیت رکھتا ہے اور ابھی تک اس میں زندگی کی قوت باقی ہے۔"

"ساتھ جذبۂ خودی بھی رکھتا ہے۔" میں نے کہا۔ "زناری برگساں نہیں ہے۔"

"اب تم لوگوں کو تو مذاق سوجھ رہا ہے۔" اعظمی نے خشکی کے ساتھ کہا۔ "یہ محسوس کرنے والی چیز ہے، تمہارے جیسی گھامڑ نہیں ہے۔"

مفتی نے کہا:

"اِس معاملے میں اعظمی کے ساتھ بھڑنے کی کوشش نہ کرو۔ یہ اِس کی فیلڈ ہے....."

"اور اس میں یہ جب چاہے باؤنسر پھینک سکتا ہے۔" مسعود نے بات کاٹی اور سب ہنسنے لگے۔

پتا ابھی تک اعظمی کے ہاتھ میں تھا اور وہ اس کو مروڑیاں دے رہا تھا:

"یہ دیکھو مفتی... یہ دیکھو۔" اس نے مفتی کو پتے کی سرتابی دکھائی اور مفتی یونہی اِس کا دل رکھنے کو "ہاں ہاں! کیوں نہیں، کیوں نہیں" کرنے لگا۔

ہم چلے جا رہے تھے اور اعظمی کہہ رہا تھا:

"پودوں کی بھی اپنی پسند اور ناپسند ہوتی ہے۔ اس وقت اسے میں سخت ناپسند ہوں اور میرے جوہرِ حیات کی لہروں سے یہ پتا گھبرایا اور بھنایا ہوا ہے اور ابھی کوئی ہاتھ اسے تھام لے، تو شاید اس کی بے چینی اور سرکشی دُور ہو جائے۔"

"وہ ہاتھ نیچے رہ گیا۔ بہت نیچے۔ آبادی میں۔ ہمارے درمیان کوئی ایسا شخص نہیں جس سے اس کا دل مل جائے۔ فی الحال یہ تمہارے پاس ہی ٹھیک ہے۔"

عمّاد نے کہا:

"مفتی صاحب! اسے آپ اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ آپ ہم سب میں زیادہ بزرگ اور حاجی ہیں۔"

"ناں ناں مفتی ناں!" لیڈر چیخا۔ "تم اس کے نزدیک نہ جانا۔ چنڈ مارے گا۔"

مفتی نے ہنس کر کہا:

"مجھے معلوم ہے۔ میں زندگی میں ہر پھول اور ہر پتے سے چنڈیں کھا چکا ہوں۔ میں اس کے نزدیک جاتا ہوں سجلا!"

اعظمی نے کہا:

"کپاس چُننے والیاں ہمیشہ عورتیں ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں، ولایت میں، امریکہ میں کوئی مرد یہ کام نہیں کر سکتا۔ کپاس کا پھول مرد کا ہاتھ پسند نہیں کرتا۔"

مفتی رُک گیا۔

"وجہ یہ ہے مفتی کہ مرد کے ہاتھ کی ویلو اور کپاس کے پھول کا جوہرِ حیات ایک دُوسرے کے بالکل اُلٹ ہیں۔ پھٹی کوکلے سے باہر نہیں نکلتی۔ زور لگاؤ، تو آدھی کوئے میں چمٹی رہ جاتی ہے۔ کچھ زمین پر گر جاتی ہے۔ نکل آئے، تو سوکھی شاخوں میں پھنس جاتی ہے۔ میں نے ملتان اور نواب شاہ کے کسانوں سے پوچھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ روئی کو خراب کرنا ہو تو مردوں کو پھٹی چُننے کے لیے کھیت میں داخل کر دو۔"

"وہ تو اس لیے ہوتا ہے میرے بھائی کہ" عمّاد نے کہا۔ "ایک تو عورتوں کے ہاتھ چھوٹے اور انگلیاں باریک ہوتی ہیں۔ دوسرے انہیں اُجرت کم دینی پڑتی ہے۔ تیسرے ملتان اور نواب شاہ کے مرد ویسے بھی سُست ہیں۔"

مفتی نے کہا:

"یہ سب بکواسی لوگ ہیں اعظمی۔ تو مجھے بتا۔"

"اور اس میں ذرا نفسیاتی ٹچ لگا دینا۔" مسعود نے ہنس کر کہا۔ "کچھ فرائیڈ کی تھیوری بھی لگا دینا کسی پودے کے ساتھ۔ بدنظری اور بدفعلی کی۔"

"بالکل! اس میں کیا جھوٹ ہے۔" اعظمی نے کہا۔ "گوئٹے اس بات کا ثبوت بہم کرتا، تو ختم ہو گیا بیچارا۔"

"گوئٹے" میں نے حیرانی سے پوچھا۔ "یہ ہمارا جرمنی والا۔ فاؤسٹ کا مصنّف!"

"جناب!" اعظمی نے چیخ کر کہا اور اس کی چیخ خاموشی میں خوف بن کر گونجی۔ "وہی۔ شاعر، ناول نگار، فلسفی، آپ کی جرمنی والا — آپ ہی کے اٹلی میں جا کر دو سال رہا اور وہیں اس نے اعلان کیا کہ پودوں میں بھی نر مادہ ہے اور ان میں بھی بھوگ ہوتا ہے۔ لمبی ایستادہ ڈنڈی نر ہوتی ہے اور گھومتی بل کھاتی ڈنڈی مادہ ہوتی ہے۔ پودا ہماری دُنیا میں زندگی کا واحد ترجمان ہے، جس کی مادہ اندھیرے میں بڑھتی پھلتی اور پھولتی ہے اور کششِ ثقل کے خلاف چلتی ہے اور اس کا نر ہماری آپ کی اور دوسرے جانداروں کی طرح روشنی میں پلتا ہے اور کششِ ثقل کے مطابق چلتا ہے۔"

اعظمی کی یہ بات سُنکر ہم سنجیدہ ہو گئے۔ کہنے لگا:

"گوئٹے کو نیوٹن سے تو یہی شکایت ہے کہ اس نے گریویٹیشن کی بات تو کی، لیکن لیویٹیشن کی بات نہ کر سکا۔"

"لیویٹیشن کیا!" ہم سب نے ایک ساتھ پوچھا۔

"کششِ ثقل کے خلاف اُٹھنا۔" مفتی نے کہا۔ "جیسے یوگی بغیر کسی مادی مدد کے زمین سے اُوپر اُٹھ جاتے ہیں، جیسے اولیاء اللہ ہوا میں اُڑ کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچ

جاتے ہیں۔"

اعظمی نے کہا:

نیوٹن نے یہ تو دیکھ لیا کہ سیب اُوپر سے نیچے کو گرا، لیکن یہ نہ معلوم کر سکا کہ اُوپر کیسے چلا گیا، درخت پر۔"

"ہے کہ نہیں گدھا" لیڈر نے کھج کر کہا۔ "سیب درخت کو نہ لگتا، تو اور تیرے باپ کو لگتا۔"

مفتی نے کہا:

"تم آگے بات کرو اعظمی! یہ بے وقوف لوگ ہیں، ایسی باریک بات کو نہیں سمجھیں گے۔"

"دیکھیں مفتی جی!" اعظمی نے کہا۔ "جس طرح کشش ثقل کی فیلڈ سے دُور ہونے پر آہستہ آہستہ اس کی کھینچ کم ہونے لگتی ہے اور وہ کمزور ہونے لگتی ہے، اسی طرح لیویٹی کی فیلڈ سے نکلنے پر اس کی اُٹھانے کی طاقت کم ہونے لگتی ہے۔ کشش کا مرکز اندر ہے، لیویٹی کا باہر یہی وجہ ہے کہ کشش کی وجہ سے چیزیں گرتی ہیں اور لیویٹی کی وجہ سے اُٹھتی ہیں۔"

"کیسے کیسے کیسے" عمّاد نے پوچھا۔

"گویا گریویٹی کا مرکز زمین میں ہے" مفتی نے کہا۔ "اور لیویٹی کا کاسمک ورلڈ میں۔"

"شاباش!" اعظمی کا چہرہ فرطِ مسرّت سے کھلکھلا اُٹھا۔ اس نے مفتی کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا۔ "دیکھو مفتی جی! طوفان، بادل، باراں، سیلاب، گریویٹی کی وجہ سے زمین کی طرف کھنچتے ہیں اور آتش فشاں مادہ لیویٹی کے زور پر آدھ آسمان کی طرف لپکتا ہے۔"

پتہ نہیں اعظمی کی بات کہاں تک درست تھی اور اس نے بچوں جمع کرتے کرتے یہ علم کدھر سے سیکھ لیا تھا۔ ہم خاموش ہو گئے۔

عمّاد ابھی تک اس مسئلے کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی چھڑی اعظمی کے کندھے پر ماری اور کہا:

"تمہارا مطلب ہے لیوٹی کا مرکز ایتھر ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا۔" اعظمی نے کہا۔ "لیکن اس قدر ضرور کہوں گا کہ جہاں گریوٹی کی پل (PULL) کم ہونے لگتی ہے، وہیں سے لیوٹی کی سرحد شروع ہوتی ہے۔"

"یہ بھی آیا مفتی کی لائن پر!" مسعود نے ہنس کر کہا۔ "پتہ نہیں لوگ آخری عمر میں مفتی کی نقل کیوں اُتارنے لگ جاتے ہیں، حالانکہ ساری زندگی اس کا سارا زور جنس پر رہا ہے۔"

"اپنا نہیں!" اعظمی نے شرارت سے کہا۔ "اس کے علم کا۔"

مفتی نے ایک لمبی سانس لی اور رُک کر بولا:

"اب میں تم جیسے جاہل لوگوں کو کس طرح سے سمجھاؤں کہ یہ جنس، محبت، معرفت، عبادت ایک ہی حقیقت کی مخصوص کروٹیں ہیں۔ کبھی ان کے درمیان خط کھچ جاتا ہے۔ کبھی نہیں کھچتا۔ کبھی کسی حصے سے ایک مخصوص خوشبو آنے لگتی ہے، کبھی نہیں آتی۔ لیکن زیادہ کیفیت گھلی ملی سی رہتی ہے، جیسے گلاس کے اندر برف کی ڈلی۔ الگ بھی ہوتی ہے اور پانی کا ایک حصہ بھی ——— الگ سے دیکھو تو کنارہ رہتی ہے، لیکن پانی میں چھوڑ دو، تو کنارہ نظر نہیں آتا۔ جو پگھل رہا ہو وہ پانی ہے۔ جو نظر آ رہا ہے وہ ڈلی ہے۔ کچھ لوگ ڈلی کو جنس کہتے ہیں، عبادت کو پانی سمجھتے ہیں اور بجا پ کو معرفت تصور کرتے ہیں، لیکن ہے ایک ہی بات۔ سب شانیں سرکاری ہیں!"

"کچھ ڈی ایچ لارنس کا سا فلسفہ ہے یہ۔"

"اوئے لارنس کے باپ کا ہے گدھے۔" مفتی چڑ کر بولا۔ "اس سے بہت پہلے دُنیا کے مختلف حصّوں میں جنس کی اور فیلس کی پُوجا ہوتی رہی ہے۔ آج بھی سارا یورپ تنتر اکی طرف لوٹ رہا ہے۔"

"تنترا!" عماد نے حیرت سے پُوچھا، تو لیڈر کو غصّہ آگیا۔ اس نے جھڑک کر کہا۔ "جنتر منتر تنتر نہیں سُنا؟ ہم نے ایک پروگرام نہیں کیا تھا اس پر!"

"یہ وہ تنتر نہیں کھوتے!" مسعود نے کہا۔ "یہ دُوسرا تنتر ہے مفتی والا۔"

"بھائی جی!" مفتی نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "اگر جنسی اتّصال کو پاکیزگی کے ساتھ

اور تمام لوازمات تقدس کو ملحوظ رکھ کر عمل میں لایا جائے، تو اس سے ایک رُوحانی برقی قوت پیدا ہوتی ہے۔"

"کس میں؟" لیڈر نے بے چینی سے پُوچھا۔

"کسی شخص میں نہیں،" مفتی نے کہا۔ "ماحول میں گرد و پیش میں۔ تمام اجسام موجود میں۔ اس سے وہ الفاریز معرضِ وجود میں آتی ہیں جو رُوح کی بالیدگی کے لیے مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ مشاہدہ کیا گیا ہے کہ اگر انسان پُورے تیس منٹ اسی حالت میں پُرسکون، خاموش، چُپ چاپ اور بے حس و حرکت رہے تو اٹھائیسویں منٹ پر ایک نُورانی کلک ہوتا ہے، لیکن اس کے لیے لازم شرط پاکیزگی کی ہے اور فریقین کا مطہر زوج ہونا ضروری ہے۔ خُدا جانے کہاں تک درست ہے، لیکن میں نے پبلک لائبریری کی ایک کتاب میں دیکھا تھا، سن سنتالیس میں۔ مجھے اس کی تفصیلات اچھی طرح سے یاد تھیں، لیکن ان دنوں لاہور میں بہت سے شامی لوگ تانگوں میں گھوما کرتے تھے۔ جن میں سے ایک کے ساتھ میری جھڑپ ہو گئی تھی اور اُس نے میری ٹھوڑی پر زور کا مکّا مارا تھا۔"

"اور تُو نے کچھ نہیں کیا،" لیڈر نے غصے سے کہا۔

"انگریز کا زمانہ تھا۔ جنگ نئی نئی ختم ہوئی تھی اور بھر میں ان سے کمزور تھا۔"

یہ اس زمانے کی بات ہو گی جب مفتی قصور میں اسکول ماسٹر تھا اور اس پر کئی مقدمات بنے ہوئے تھے اور اس کا اِس بھری پُری دُنیا میں کوئی بھی دوست نہ تھا۔

اعظمی نے کہا:

"مفتی! پودوں میں یہ اتّصال بڑی پاکیزگی سے ہوتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے پھُولوں اور پھلوں کی کثرت اور ان کے دانوں کا شمار دُوسری ساری مخلوقات سے زیادہ ہے اور ہر طرح سے مفید ہے۔ پاکیزگی اپنے لیے بھی نعمت ہے اور ماحول کے لیے بھی خیرِ کثیر کا درجہ رکھتی ہے۔ انسان اور حیوان اس نعمت سے بڑی حد تک محروم ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ شریعتوں میں بعض جانوروں کو حرام قرار دیا گیا ہے اور بعض کو نجس۔"

عماد کو یہ بات درست معلوم ہوئی اور وہ بڑی حد تک خاموشی کے ساتھ اثبات میں سر

ہلاتا رہا۔ اچانک کوہستانی ہماری ٹکڑی سے یُوں ریٹا جیسے اس کو بارُود لگ گئی ہو۔ اس نے سامنے کے دو تین بڑے پتھروں پر اپنے قدم جمائے اور پہاڑ پر پندرہ بیس فٹ اُونچا چڑھ گیا۔ ایک چھوٹے سے نشان پر پانی رسنے کی وجہ سے کائی پیدا ہو چکی تھی اور وہاں لگو مُتے کی شکل کی نباتاتی چھتریاں سی کھڑی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک پھُول تھا جسے کوہستانی نے پہلے اُونچی آواز میں السّلام علیکم کہا، پھر دونوں ہاتھ اُٹھا کر کچھ دُعا مانگی اور وہ پھُول توڑ لیا۔ جس تیزی کے ساتھ وہ اُونچائی پر چڑھا تھا اُسی سُرعت سے واپس آگیا اور اپنی محبّت اور عقیدت کا یہ تحفہ اعظمی کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ عجیب سا پھُول تھا۔ لمبا ڈنٹھل، عام پنسل کے گھیر کا۔ آگے ایک بیضوی سرسبز گانٹھ کسی قدر ملائم، اس کے بعد سبزی مائل پیلے رنگ کی پتّیوں کی ابتدا جو درمیان میں جا کر بنفشی ہو گئی تھی اور آخر میں ان کی نوکیں ایک سیاہ گول کنارے کے ساتھ مل گئی تھیں۔ یہ سیاہ کنارہ کیسٹ کے ٹیپ جتنا چوڑا تھا اور کافی مضبُوط نظر آتا تھا۔ اندر سندھوری رنگ کا ایک چھوٹا سا انگشتانہ تھا، جس میں چھوٹے چھوٹے بے شمار سوراخ تھے۔ اعظمی نے اس پھُول کو غور سے دیکھ کر کہا:

"فینا فلور ہبر ٹیئم امس ہے۔"

میرا مطلب ہے اس نے کچھ اس قسم کا نباتاتی نام لیا تھا اور ہم اس کے علم نباتات کے آگے خاموش رہنے پر مجبُور ہو گئے۔

کوہستانی نے کہا:

"اس کو بسم اللہ کر کے زور سے سونگھو صیب!"

جب اعظمی سُونگھنے لگا، تو کوہستانی نے اس کا ہاتھ روک لیا اور پھر بولا:

"سُونگھتے وقت قل ہو اللہ شریف پڑھنی ہے اور ایک ہی سانس میں۔"

"اس کا کیا فائدہ؟" اعظمی نے زچ ہو کر پُوچھا۔

"بس ہو گا ناں یار کوئی!" مفتی نے کہا۔ "جو وہ کہتا ہے کرو، اپنا علم ہر جگہ نہ اپلائی کیا کرو۔"

اعظمی نے وہ پھُول مطابق ترکیبِ استعمال سُونگھا اور پھُول مسعُود کو دے کر بولا: "کچھ بھی نہیں۔ سالے میں کوئی خوشبو ہی نہیں!"

مسعود نے سونگھا۔ تو اس نے بھی بے خوشبوئی کا اعلان کیا، پھر ہم سب نے باری باری اس کو سونگھا اور مفتی کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نے پھول ہاتھ میں لیے بغیر بڑی متانت سے کہا:

"اب میرے سونگھنے کی کیا ضرورت رہ گئی ہے۔ ٹھیک ہے۔ نہیں خوشبو تو نہ سہی۔"

پہلے اعظمی زمین پر بیٹھا، اس کے بعد مسعود اور پھر ہم سب۔ کوئی چوکڑی مار کر، کوئی ٹانگیں آگے پھیلا کر، کوئی پتھر سے ٹیک لگا کر۔ صرف مفتی اور کوہستانی کھڑے تھے اور ہمارے سامنے نیچے کی وادی ڈھائی تین ہزار فٹ نیچی، چھوٹے چھوٹے درختوں اور ننھے ننھے پہاڑی ٹیلوں والی، آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھ رہی تھی، جیسے کہار کا گھومتا ہوا چاک آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھنے لگے۔

وہ اُوپر کو چڑھ رہی تھی اور جہاں ہم بیٹھے تھے وہ زمین نیچے کو جا رہی تھی جیسے اُوپر کی منزل سے لفٹ نیچے کو جایا کرتی ہے، لیکن ان دونوں مخالف حرکات کے باوجود سارا منظر جُوں کا تُوں ہمارے سامنے موجود تھا۔

اعظمی نے کہا:

"بارش آ رہی ہے۔"

"ہاں آ رہی ہے۔" لیڈر نے جواب دیا۔

"کہاں؟" مسعود نے پوچھا۔

"وہ ... وہ ... نیچے۔" اعظمی نے جواب دیا۔

عمّاد ہنسا اور سر جھٹک کر بولا:

"بیوقوفو! بارش کبھی نیچے سے اُوپر کو بھی ہوئی ہے۔"

لیڈر نے کہا:

"دیکھ لو تمہارے سامنے ہے۔ کس قدر زبردست بچھوا اُٹھ رہی ہے اُوپر کو۔"

اعظمی نے کہا:

"اولے بھی اچھل رہے ہیں کہیں کہیں"

عمّاد نے غور سے دیکھا، تو کھسیانا ہو کر بولا:

"واقعی یار! یہ عجیب فنومنا ہے۔ ہم اس کو جلد پکڑ لیں گے راستے میں"

"لیکن ہم تو اُوپر جا رہے ہیں" مسعود نے کہا۔

"اُوپر!" اعظمی حیرت سے بولا: "اُوپر تو نہیں جانا تھا۔ تمہیں بھی تو جانا تھا عمّاد"

"میں کب کہتا ہُوں کہ نہیں جانا تھا" عمّاد نے کہا۔ "لیکن اب ہم تھک کر خود ہی نیچے جا رہے ہیں۔ آپ سے آپ"

لیڈر اپنی دونوں ٹانگیں راستے میں پسار کر بیٹھا تھا اور اپنے بُوٹ کی ٹو پر سوٹیاں مار رہا تھا۔

مجھے اتنا یاد ہے کہ ہم سب راستے میں بیٹھے تھے اور مفتی اور اس کا کوہستانی ہمارے سامنے کھڑے ہم کو دیکھ رہے تھے۔ مفتی کچھ حیران اور کچھ متردد تھا اور کچھ خوش بھی تھا اور کوہستانی ہنس ہنس کر اسے کچھ بتا رہا تھا۔

مجھے صرف اس قدر یاد تھا کہ میں وہاں راستے میں بیٹھا تھا اور میرے ساتھ میری پارٹی کے دُوسرے دوست بھی بیٹھے تھے، لیکن اس کے آگے پیچھے اور کچھ نہیں تھا۔ صرف بارہ مئی سن اکتالیس کی جالندھر چھاؤنی تھی اور اُس کے اندر اٹھارہ بیس کنال کی ایک کوٹھی تھی اور اس کوٹھی کے سامنے والے لان پر ایک ڈنر تھا جو کرنل دیال نے اپنے ساتھی افسروں کو دیا تھا۔ ان افسروں میں میرا ڈاکٹر بہنوئی بھی تھا جو کرنل صاحب کے پُرزور اصرار پر مجھے بھی اپنے ساتھ لے آیا تھا — اس سے پہلے کی کوئی زندگی نہ تھی۔ اس کے بعد کی کوئی زندگی نہ تھی۔ آس پاس کچھ نہیں تھا۔ بس جالندھر چھاؤنی تھی اور وہ شام تھی اور میرے سامنے دو آدمی کھڑے تھے ایک مفتی اور دوسرا کوہستانی جس کو ہم نے مفتی جی کے اٹھانے پر مامور کیا تھا۔

مجھے اپنی ساری زندگی یہ واقعہ کبھی یاد ہی نہ آیا تھا۔ جالندھر چھاؤنی تو ایک طرف میرے ذہن سے سارا ہندوستان نکل چکا تھا اور اب وہاں ماضی کی کوئی چیز بھی محفوظ نہ تھی۔ نہ شعور میں، نہ لاشعور میں، نہ تحت الشعور میں، نہ بے شعور میں، نہ وقوف میں اور نہ بے وقوف

میں۔

اور اس وقت میرے سامنے کرنل دیال کے لان کے سارے تنکے اپنی اصلی حالت میں موجود تھے۔ سارے مہمانوں کے چہرے میرے سامنے تھے۔ میجر آفندی کی پی کیپ کرسی کی بیک سے گر گئی تھی، تو میجر نے اسے اٹھا کر جھاڑا تھا۔ تین مرتبہ زور سے پھونک ماری تھی اور پھر اس کو وہیں ٹانک دیا تھا جہاں سے گری تھی۔ ایک بیرے کے پاس شیشے کا جگ تھا اور دوسرے کے پاس تام چینی کا۔ تام چینی کے جگ سے ایک چھوٹی سی چپڑ اتری ہوئی تھی اور اس نشان کی شکل چتکبرے خرگوش کے منہ سے ملتی تھی۔ ایک افسر کی بیوی بہت کالی اور بہت موٹی تھی اور اس نے بینگنی رنگ کی ساڑی باندھی ہوئی تھی اور اس کے بلاؤز پر جابجا پسینے کی باؤلیاں تھیں۔

کوٹھی کے برآمدے میں کھپریل کی چھت کے نیچے ایک چھپکلی دیوار پر کیڑے مکوڑے مچھر بھنگے پکڑ رہی تھی اور اس کی دم کٹی ہوئی تھی۔ کرنل محی الدین بید والی لمبی آرام کرسی میں لیٹے ہوئے تھے اور انہوں نے اپنی ایک ٹانگ کرسی کے چپٹے آرم پر رکھی ہوئی تھی۔ ان کے فل بوٹ کا چمڑہ بہت سخت نظر آتا تھا اور ان کی اونی جرابیں نئی اور فریش تھیں۔ کرنل محی الدین کی خاکی پتلون کی گدری بہت تنگ تھی اور وہ یوں لیٹے ہوئے تھے جیسے ان کی پتلون کی جیب کے آخری کونے میں صابن کی ایک ٹکیہ ہو۔

اتنے سالوں کے بعد آج، اس وقت، سیف الملوک کے راستے میں زمین پر بیٹھے ہوئے مجھے کرنل دیال کی لڑکی اس ڈنر پارٹی میں ہر چیز سے حسین دکھائی دی۔ اس کی ماتا مر چکی تھی اور آج کے ڈنر کا سارا انتظام پرمیلا نے کیا تھا۔ پرمیلا نے نیلی زمین پر سفید ٹمکنوں والی قمیص پہن رکھی تھی اور اس کی آستین اس کے بازوؤں میں کھبی ہوئی تھیں۔ بائیں آستین کے باہر ڈیڑھ داغ چیچک کے ٹیکوں کا نظر آتا تھا۔ باقی کا ڈیڑھ آستین کے اندر تھا۔ پرمیلا کا رنگ اپنے والد کی طرح صاف تھا کیونکہ وہ ایک کشمیری پنڈتانی کے بیٹے تھے۔ پرمیلا کے دونوں ابرو محرابوں کی طرح تھے، کیونکہ وہ کوہاٹ میں پیدا ہوئی تھیں اور اُن کا گھر مسجد کے بہت قریب تھا۔ اس کی کلائی پر سونے کی ایک چھوٹی سی گھڑی تھی، کیونکہ وہ ایم بی بی ایس کے آخری سال میں

پڑھتی تھی۔ اس کی آواز کے سارے سُر کومل تھے، کیونکہ وہ چھوٹی ہوتی زرداد خان کی بچیوں کے ساتھ مل کر نعتیں پڑھا کرتی تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھی تھی اور بیرے اس کی آنکھ کا ہر اشارہ سمجھ رہے تھے۔ اس کے پاؤں میں چمڑے کے بہت ہی پتلے تلے والی چپلیاں تھیں اور اس کے دونوں ٹخنوں پر دو چھوٹے چھوٹے پُورے چاند طلوع ہو رہے تھے۔

اس وقت پُورے پینتیس برس بعد مجھے اس کا نام بھی یاد آ گیا تھا۔ اس کا اندازِ نشست بھی سامنے تھا۔ اس کے فقرے بھی سُنائی دے رہے تھے (کانوں میں گونج نہیں رہے تھے، سامنے سے سُنائی دیتے تھے) اس کی کرسی کی پُشت پر پیتل کی ایک چھوٹی سی اُبھری ہُوئی کیل بھی دکھائی دے رہی تھی۔ اس ٹیبل کلاتھ کا کلف بھی محسوس ہو رہا ہے جہاں مَیں نے پانی پی کر اپنا گلاس رکھا تھا۔

وادی ابھی تک اسی رفتار سے اُوپر کو اٹھ رہی تھی، لیکن ہم تک نہ پہنچ پائی تھی۔ ہم اسی تیزی سے لفٹ کے ذریعے نیچے کو اُتر رہے تھے، لیکن اُتر نہ پائے تھے۔ دونوں شخص ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ ان میں ایک مفتی تھا اور دُوسرا کوہستانی جو ہم نے مفتی کو اُٹھانے کے لیے ہائیر کیا تھا۔ لیڈر کی پسری ہُوئی ٹانگیں پہلے سے لمبی ہو گئی تھیں، لیکن اس کی سوٹی اتنی ہی تھی اور اب وہ اپنے گھٹنوں پر سوٹیاں مار رہا تھا۔

مَیں باہر لان سے اُٹھ کر کوٹھی کے برآمدے میں گیا جس کے ایک کونے میں غسل خانہ تھا۔ تینوں کموڈوں کے ڈھکنے بند تھے اور لیس پاٹ لبالب بھرا ہُوا تھا۔ مَیں اسی طرح واپس آ گیا اور برآمدے کے دُوسرے کونے سے کوٹھی کے پیچھے نکل گیا۔

پیچھے سرونٹ کوارٹرز کی ایک لمبی قطار تھی، جن کی چھتیں گر چکی تھیں اور دروازے ٹوٹے ہوئے تھے۔ ایک کونے میں مرمت شدہ کچن تھا جس کے اندر بتّی جل رہی تھی۔ اس کے پہلو میں سرونٹ کوارٹرز کے کھنڈرات کے پیچھے ایک ویران سا میدان تھا جس میں رہٹ کی ایک بڑی آہنی چرخی پڑی تھی۔ اس کے قریب زنگ آلودہ ٹنڈوں کی مال کا ڈھیر تھا جس کے اندر سے ہو کر لمبی لمبی گھاس اُوپر نکل آئی تھی۔ قریب ہی ایک ٹوٹی گڈ پڑی تھی جس کا ایک ہی پہیہ باقی تھا۔ کچھ کچّی اینٹوں کے چٹّے تھے جن کے اردگرد سرکنڈے کے جھاڑ تھے۔ باوجود اس کے کہ

چاند اپنی پوری تابانی سے چمک رہا تھا، لیکن اس سے بہتر خلوت ساری چھاؤنی میں اور کہیں نہیں تھی۔ میں ابھی مناسب جگہ کا انتخاب کر ہی رہا تھا کہ مجھے پیچھے سے نمبل نمبل قدموں کی چاپ سنائی دی۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ پرمیلا اپنے چھوٹے سے رومال سے ماتھا پونچھتی میری طرف چلی آ رہی تھی۔

"یہاں گھاس بہت ہے۔" اس نے رک کر کہا۔ "اور جگہ بھی ڈزرٹڈ ہے۔"

"جی!" میں نے ادب سے جواب دیا۔ کیونکہ میں عمر میں چھوٹا تھا اور تھرڈ ڈائیر کا طالبعلم تھا۔

"ہم میں سے ادھر کوئی بھی نہیں آتا۔"

"جی!" میں نے اسی سعادت مندی سے پھر کہا اور پرمیلا کی ذاتی خوشبو کا ایک ہلکا سا جھونکا میرے چہرے سے لپٹ گیا، جیسے شیشم اور شرینہ کے پھولوں کی ملی جلی خوشبو ہو۔

وہ ایک قدم اٹھا کر میرے اور قریب آ گئی اور اپنی کنپٹیوں کا پسینہ رومال میں جذب کرنے لگی۔ اس کی اٹھی ہوئی کہنی کے نیچے سے ایک اور جھونکا آیا، جیسے شیشم اور شرینہ کے جھنڈ میں سے کار گزری ہو۔

میں نے پوری آنکھیں کھول کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کوہاٹ کے محرابی حسن پر نور ہی نور تھا۔ میں نے اپنے دونوں ہاتھ ناف پر باندھ لیے اور میرا دل چاہا کہ میں بھی ایم بی بی ایس میں داخل ہو جاؤں یا مندر میں پوجا کرنے لگوں یا پھر میری بھی ماں مر جائے یا میں اپنی باقی زندگی کوہاٹ میں گزار دوں یا میں ابھی نماز پڑھنے لگوں یا ابھی لیٹ جاؤں۔ میں نے دیکھا سامنے ایک ٹوٹے ہوئے سرونٹ کوارٹر کے فرش پر پرالی بچھی تھی۔

اس نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور اس کے چہرے پر گہرے سیندوری رنگ کے شعلے بڑھنے لگے۔ پرمیلا میں کچھ عجیب طرح کی شفقت پیدا ہو گئی تھی۔ کامنا سے بھری ہوئی ہمدردی۔ شہوت سے لبریز پاکیزہ محبت میں ڈوبی ہوئی وہ ایک پاکدامن اور مضبوط الحواس طوائف نظر آ رہی تھی جو ساری عمر ہر شخص کو دل و جان سے اپنا بھائی سمجھتی رہی ہو۔ پرمیلا کی آنکھوں میں حیا تھی، ہونٹوں

پر جھک گئی تھی اور چہرہ لاج میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ محبّت، ہمدردی، تپاک اور اُنس کے کنارے پر کھڑی تھی اور اُس کا ایک قدم اُٹھا ہُوا تھا۔

پرمیلا اپنے "ہونے" کی آگ میں سدھائے ہُوئے سمندر کی طرح بیٹھی تھی اور پُرسکون تھی اور اس کے اردگرد پوتر تا تھی۔ مَیں گلاس میں پڑا ہوا برف کا ٹکڑا تھا جس کے پگھلتے کنارے کو یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ مَیں کنارہ ہوں یا پانی!

مَیں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس سے کہا:

"مجھ پر دیا کرو۔"

وہ ذرا سا مسکرائی اور پھر آنکھوں ہی آنکھوں میں "اچھا" کہہ کر وہاں سے چلی گئی۔

اعظمی ایک زور کی چیخ مار کر زمین سے اُٹھا اور سیاستدانوں کی طرح ہاتھ لہرا کر کہا: "اُٹھو یارو! شرم کرو! کیا راستے میں عورتوں کی طرح بیٹھ گئے ہو۔"

مسعود نے سر اُٹھا کر اس کی طرف غور سے دیکھا، پھر ہم پر نظر کی۔ اس کے بعد اپنا جائزہ لیا اور ہنسا، پھر کہنے لگا:

"چلو یار جلدی کرو۔ جھیل پر بھی پہنچنا ہے اور پھر واپس بھی آنا ہے۔"

"کیوں صیبب!" کوہستانی نے ہنس کر مفتی سے کہا۔ "مَیں بولا نہیں تھا آپ کو پُورے پندرہ منٹ! چاہے گھڑی رکھ کر دیکھ لو چاہے کلاک رکھ کر دیکھ لو — پُورا ٹیم مقرر ہے اس پھُول کا۔ نہ ایک منٹ زیادہ نہ ایک منٹ کم۔"

"اور اگر کوئی کمزور صحت والا ہو۔ بڑی عمر کا۔ میرے جیسا۔ پھر؟"

"چاہے سَو سال کا پُرانا آدمی ہو صیبب۔ چاہے پچیس سال کا جوان ہو۔ بُڈھا ہو۔ کمزور ہو چاہے تگڑا ہو، سب کو پندرہ منٹ کے بعد ہوش آ جاتا ہے۔ بالکل پہلے کا مافک ہو جاتا ہے۔ ایک دم۔"

اب ہم سب اُٹھ کھڑے ہُوئے تھے اور آہستہ آہستہ پھر چلنے لگے تھے۔

اب سُورج گھوم کر ایک ایسے رُخ پر آ گیا تھا جس کا جغرافیے کی دنیا میں کوئی نام نہیں۔

اعظمی نے کانی آنکھ سے سُورج کی طرف دیکھا اور کہستانی سے پُوچھا۔

"سُورج پہلے اُدھر نہیں تھا؟"